کارنامۂ حسین علیہ السلام کی منفرد خصوصیت

علامہ سید علی محمد نقوی صاحب علی گڑھ

گلشن عالم میں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک کروروں واقعات کے رنگا رنگ پھول کھلے اور مرجھا گئے۔کوئی جلدی ہی دور خزاں کی نذر ہوگیا،کوئی دیر میں مرجھا گیا،کسی پھول کی خوشبو صرف اسی تک محدود رہی کسی کی ذرا دور تک گئی،اور بعض ایسے پھول کھلے جنھوں نے اپنی خوشبو سے پورے گلستاں کو معطر کردیا،جس سے گلشن کے سبھی باسی فیضیاب ہوئے مگر پھر جب باد خزاں کے جھونکے سنسنائے تو نہ یہ پھول رہ گئے نہ ان کی خوشبو،گلزار کی دوسری نسلوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ یہاں کوئی ایسا پھول بھی کھلا تھا۔جس کی خوشبو کے سائے میں ہمارے آبا و اجداد رنج و آلام کے سورج کی نہ جانے کتنی تکلیف دہ کرنوں سے بچ گئے تھے،مگر ان واقعات کے ان گنت پھولوں میں ایک ایسا پھول بھی کھلا،جس کی خوشبو نہ صرف اسی تک محدود رہی بلکہ گلزار کا کونہ کونہ اس سے بس گیا۔باد خزاں کے جھونکے آتے جاتے رہے،تاریخ کے اوراق پلٹتے رہے،آشیاں بنتے اجڑتے رہے،بجلیاں گرتی رہیں،تباہیاں گلشن کا طواف کرتی رہیں مگر اس پھول کی خوشبو جس طرح تھی اسی طرح قائم رہی۔

یہ واقعہ کربلا تھا:

واقعات واتفاقات وحادثات کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ہر انسان کی زندگی میں اس کے تناسب سے دو ایک قابل لحاظ واقعات ضرور رونما ہوتے ہیں۔مگر ایسے واقعات بہت کم عالم وجود میں آتے ہیں جن کی روشنی اس انسان کی ''تنگنائے ذات'' سے نکل کر دوسرے کے لئے شمع راہ بن گئی ہو۔بعض ایسے عظیم واقعات رونما ہوئے،جن میں ایک حد تک لوگوں نے اپنے درد کا درماں تلاش کیا،مگر یہ واقعات بھی زمانے کی رفتار کا چند صدیوں تک ساتھ دینے کے بعد ماضی کی پر ہول تاریکیوں میں ٹمٹما کر رہ گئے اور کاروان بشر ہی آگے بڑھ گیا۔نئی نسلوں کے لئے یہ گونا گوں واقعات محض نقش و نگار طاق نسیاں بن کر رہ گئے۔اب اگر کسی مورخ نے پرانی تاریخی کتابوں کا عصا اور اپنے علم و عقل کا چراغ لے کر ماضی کی تاریکیوں میں جانے کی ہمت کی تو اسے ان واقعات کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں نظر آگئیں اور بس۔مگر یہ کارنامۂ حسینی کی خصوصیت ہے کہ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے والی نسلوں کے لئے چراغ ہدایت تھا اسی طرح بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے ہے۔جس طرح تیرہ سو سال قبل کے انسان واقعۂ کربلا میں اپنے درد کا درماں تلاش کر سکتے تھے اسی طرح آج کی نسل بھی اس میں اپنے زخم کا مرہم ڈھونڈ سکتی ہے۔یہ حسینی کردار کا امتیاز ہے کہ ہم کو اس دور میں بھی توشۂ حیات فراہم کرتا رہا،جب ہم

اسیر توہمات تھے، اور آج بھی ہمیں سرمایۂ حیات فراہم کر رہا ہے، جب ہم خواب وخیال کے شیش محل سے نکل کر حقائق کے سورج کی کڑی دھوپ میں سرگرم عمل ہیں، ان منزلوں پر بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے کردار پگھل جاتے ہیں، بڑے بڑے ارباب نظر تھرا کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کانپ کانپ کر سپر ڈال دیتے ہیں۔

بڑے بڑے رہنما اصولوں کے سوتے اس انسانی عقل وفہم کی تیز دھوپ میں خشک ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ حسینی اصولوں کے سوتے ہیں جو جیسے جیسے عقل وعلم کی دھوپ تیز ہوتی جارہی ہے ابلتے چلے جارہے ہیں۔

سوائے واقعۂ کربلا کے کوئی دوسرا واقعہ نہیں جو ہمارا تاریخ کے ہر ہر موڑ پر ساتھ دیتا رہا ہو۔ یہ حسینی کارنامے کی منفرد خصوصیت ہے کہ ہم تیرہ سو سال قبل بھی اپنے مسائل کا حل اس میں تلاش کر سکتے تھے اور آج بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں انسان جن مسائل سے دوچار ہے ان میں جنگ کی تباہیوں کو روکنے اور دولت وافلاس کے درمیان جو خلیج ہے، اسے پاٹنے کے مسئلے سب سے اہم ہیں۔ جنگ کے خلاف آج ہر طرف امن کانفرنسیں بلائی جارہی ہیں۔ فلاسفہ وحکماء حل پیش کر رہے ہیں۔ کوئی پُر امن بقائے باہم کا اصول پیش کر رہا ہے، کوئی اہنسا کا درس دے رہا ہے، کوئی ''جیو اور جینے دو'' کی پرانی بات کو اپنی اپنی لفظوں میں دہرا رہا ہے مگر دراصل یہ تمام حل حسینؑ اپنے کردار وگفتار سے آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل پیش کر چکے ہیں، جو کربلا کے بن میں خون کی رنگین دھاروں سے لکھے گئے تھے۔ ان پھولوں کا رنگ وروپ دور سے اجنبی محسوس ہوتا ہے مگر قریب جاکر ''ذوق نظارہ'' کو قوت احساس میں سمو کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خوشبو وہی ہے جو گلدستۂ کربلا سے ۶۱ھ میں اڑی تھی اور جس سے آج تک بعض انسانی مشام جاں بسے ہوئے ہیں، ہلال محرم نے اپنے سفر کا آغاز ہی کیا تھا کہ شبیری قافلہ اپنی منزل پر پہونچ گیا۔

مہینے کی دوسری تاریخ حسینؑ سرزمین کربلا پر آگئے، اور تیسری سے یزیدی فوجیں آنا شروع ہوگئیں۔ نو محرم تک کربلا کا ریتیلا میدان افواج یزیدی سے لبالب ہو چکا تھا۔ زمین کثرت نفوس سے چھلک رہی تھی، کاروان فطرت اپنی عمر میں پہلی بار ظلم وستم کا اس بڑے پیمانے پر ننگا ناچ دیکھنے کے لئے تیار ہو رہا تھا، اور اس وقت یزیدی افواج کا سردار عمر سعد حسینؑ سے صلح کی بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔

امام حسینؑ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھ کو ہندوستان یا کسی اور دور دراز ملک میں چلے جانے دو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حسینؑ کی یہ شرط پرامن بقائے باہم اور ''جیو اور جینے دو'' کے اصول کا سنگ بنیاد نہیں ہے۔

''اگر تم ہماری ذات کو اپنے اور اپنے مشن کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ اور حق کی آنچ سے تمہارے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں تو ہم تمہاری سلطنت ہی سے باہر چلے جانے کو تیار ہیں، پھر تو تمہارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔''

کیا کوئی ہمیں بتا سکتا ہے کہ ''جیو اور جینے دو'' کا اصول حسینی ارشاد کی صدائے بازگشت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قرآن ناطق حسینؑ کے دہن سے جو پھول بن کر فضا میں بکھر گیا، وہ اس سے پہلے قرآن سامت کے صفحات پر روشنائی بن کر بکھر چکا تھا۔ سورۂ کافرون کی آیت ''لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ'' (تمہارا دین تمہارے ساتھ ہے اور ہمارا دین ہمارے ساتھ) کس کو یاد نہیں۔

پیغمبرؐ خدا تو ارشاد فرما ہی چکے تھے کہ حسینؑ اور قرآن کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ جو قرآن بزبان بے زبانی کہہ چکا تھا وہی حسینؑ نے عمر سعد سے کہا۔

آج کل تشدد کے مقابلہ کے لئے ایک اور ہتھیار کا بڑے زور وشور سے نام لیا جاتا ہے، جس کا تجربہ بظاہر سب سے پہلے ہمارے ہی ملک میں ہوا تھا۔ یہ اہنسا ہے جس میں ظالم کو اپنے اخلاقی جوہروں سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اس ہتھیار سے بھی دنیا کو روشناس کرا دیا۔

وہ موقع ہے جب ابن زیاد حاکم کوفہ کی طرف سے ایک ہزار سپاہی حر کی قیادت میں حسینؑ کا راستہ روکنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن سب پیاس سے جاں بلب ہیں۔ سواروں کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی زبانیں منھ سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ عرب کی دوپہر کا غضبناک سورج گویا جہنم کو دنیا پر انڈیلے دے رہا ہے، اور اس صورت حال میں حسینؑ یہ جانتے ہوئے کہ ساتھ میں پھول جیسے بچے اور عورتیں ہیں اپنے قافلے کی مشکیں دشمن کی سیرابی کے لئے کھلوا دیتے ہیں اور یہاں تک پانی پلواتے ہیں کہ جب تک مرکب اور راکب خود منھ نہیں ہٹاتے۔ مشک کے دہانے بند نہیں کئے جاتے۔

کیا اس برتاؤ سے پتھر کا دل بھی نرم نہیں ہو سکتا؟ کیا آج بھی کردار کے ایسے سانچوں سے جنگ آزمائیوں کو مکمل امن وسکون میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کربلا میں جس دشمن سے سابقہ پڑا تھا، وہ انسانیت ہی سے معرا تھا، وہ اپنے ارادوں سے صرف اسی صورت میں باز آ سکتا تھا کہ اپنے اصولوں اور مقاصد کے سر، ایک زریں طشت میں سجا کر اس کے سامنے پیش کئے جاتے اور حسینؑ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے اصولوں کی قربانی پیش کر کے ایمان و شرافت حسن وصداقت اور انسانیت، سب کے خون میں اپنے ہاتھ رنگتے۔ تاریخ کی روشنی میں راہ دیکھتے وقت امام حسینؑ کا ایک اور ایسا قول ملتا ہے جو تمام کشمکشوں کا واحد حل ثابت ہو سکتا ہے۔

موقع وہ ہے جب فوج حر کو پانی سے سیراب کرنے کے بعد امام حسینؑ اور حر کے مابین گفتگو کے نتیجے میں طے ہوتا ہے کہ امام نہ کوفے کی سمت جائیں، نہ مدینے کی جانب، بلکہ ایک تیسری طرف جائیں، اور یزیدی لشکر نگرانی کے لئے ساتھ ساتھ رہے یہی تیسرا راستہ فرات کی طرف رہنمائی کرتا تھا، جب حسینی قافلہ اور یزیدی لشکر کربلا پہونچا تو حاکم کوفہ کا حر کے پاس حکم آ گیا کہ حسینؑ جہاں ہیں وہیں روک دو۔ حسینؑ اتر جاتے ہیں اور اپنے جانبازوں کو حکم دیتے ہیں کہ دریا کے کنارے خیمے نصب کرو۔ حر آ کر کہتا ہے کہ

ہمیں تاکید ہے کہ آپ کے قافلے کو ایسی جگہ اتروائیں جہاں نہ پانی ہو نہ گھاس تاکہ حسینی قافلے کے انسان بھی بھوکے پیاسے رہیں اور جانور بھی یہ سنتے ہی اصحاب حسینؑ بپھر جاتے ہیں۔ زہیر بن قینؑ جو قریب ہی کھڑے تھے عرض کرتے ہیں ''مولا''، ہم کو ان سے نپٹ لینے دیجئے ورنہ اس کثرت سے کمک آجائے گی کہ مقابلہ دشوار ہوجائے گا۔

حسینؑ نے زہیرؑ کے اس دوستانہ مشورے کا جواب دیا ہے اگر اسی کو ہر انسان، ہر ملت اور ہر طاقت گرہ میں باندھے اور دل میں اتارلے تو جنگ کے بادل افق جہاں پر سے چھٹ جائیں اور انسان کھلی فضا میں سانس لے سکے۔

حسینؑ فرماتے ہیں، زہیر! میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آج ہر ایک صرف اتنا ہی طے کرلے کہ وہ جنگ میں پہل نہیں کرے گا تو جنگ ہو ہی نہیں سکتی۔ حسینؑ کا یہ جملہ آج کے پورے مسئلۂ جنگ کا حل ہے۔ امام حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جو اصول پیش کئے ہیں۔ اگر انسان ان پر سچے دل سے عمل کرنے کی ٹھان لے تو تمام کشمکش مکمل دوستی اور تمام جنگ آزمائیاں مکمل امن اور تمام اختلافات مکمل ہم آہنگی میں بدل سکتے ہیں۔

آج کی دنیا کا دوسرا سب سے اہم مسئلہ ''مساوات'' کا ہے۔ دنیا میں آج باہمی انسانی تفریق کی نہ جانے کتنی دیواریں کھڑی ہیں۔ کتنے غیر انسانی اور غیر فطری بت پوجے جارہے ہیں، کوئی کالوں کو بنی نوع انسان میں داخل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، کوئی بے سہارا اور بیکس لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا اپنا مذہب خیال کرتا ہے، کوئی ممالک کے ڈھکوسلوں میں گرفتار ہے، دوسرے ملک والے کو گویا خاک کا پتلہ بھی نہیں سمجھتا۔ غرض اب تک نا جانے کتنے دماغوں پر پیسے اور رنگ وروپ کی منحوس حکومت قائم ہے، کتنی عقلوں پر سرمایہ داری کی مہر لگی ہوئی ہے، مگر اب انسان خواب غفلت سے چونک رہا ہے اب اس محدود ''آدمیت'' کا طلسم ٹوٹ رہا ہے، عقائد کی یہ غیر فطری زنجیریں پگھل رہی ہیں۔ ہر طرف سے اس حیوانی جذبہ کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ انسان اس تفریق کے ختم کرنے پر غور کررہا ہے مگر اب بھی وہ کسی حل سے کوسوں دور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو مسئلے کا حل تلاش کررہے ہیں، اکثریت ایسوں کی ہے جن کے ذہنی سانچے قوم پرستی اور سرمایہ داری میں ڈھلے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اسلام نے آج سے صدیوں پہلے دنیا کو پیغام دیا تھا، کہ سب انسان ایک خدا کے خلق کردہ ہیں، چاہے گورے چاہے کالے چاہے عجم چاہے عرب، چاہے مفلس چاہے سرمایہ دار، اس پیغام کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کی ذہنیت ایسی بن جائے کہ وہ اپنے کردار سے کسی قسم کی تفریق کا مظاہرہ نہ کرسکیں آج کے مصلح زبان سے تو بہت کچھ کہتے ہیں، سرمایہ داروں اور قومیت پسندوں کو خوب خوب سناتے ہیں، لیکن اگر شامت اعمال سے کوئی مفلس زدہ حالت میں اطلس وکم خواب کے حریری پردوں کو چھیڑتا اور ریشمی قالینوں کو کچلتا ہوا ان کے شبستان کی محفل طرب میں داخل ہو جاتا ہے تو ان کی

پیشانیوں پر بل آجاتے ہیں، زبان بے قابو ہوجاتی ہے، یہ ان مصلحین کے کردار گفتار کی یکسانیت! جب خود معالج، مرض کا ہمدرد ہوتو مریض کی صحت کا خواب شرمندہ تعبیر ہوہی نہیں سکتا۔

واقعۂ کربلا میں حسینؑ نے اپنے کردار سے دنیا کو روشناس کرادیا کہ مساوات کیا شے ہے؟

حسینؑ کے چھوٹے سے قافلے کا ذرا چشم تصور سے نظارہ کیجئے! اس میں ہاشمی نوجوان بھی ہیں اور غیر ہاشمی سورما بھی، عرب بھی غریب غلام بھی، قبیلوں کے سرادار بھی، حبشی رنگ بھی اور عربی حسن بھی اور حسینؑ کربلا کے ایسے ہوشربا ماحول میں ان کے درمیان مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جو پکارتا ہے امام بہ نفس نفیس اس کے سرہانے جاتے اور کڑیل جوان نورنظر علی اکبرؑ کے سرہانے جاکران کا سرزانو پر لیتے ہیں، تو غلام جون کی آواز پر بھی جاکر اس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہیں۔ جنگ کے لئے میدان میں جاتے وقت اگر ماںجائی بہن زینبؑ سے رخصت ہوتے ہیں تو کنیز فضہ کو بھی آخری سلام کرتے ہیں، یہ ہے حسینی کردار!

بیسویں صدی میں دولت و افلاس، سیاہی و سفیدی، عرب وعجم کے درمیان خلیج، نہ ان مصلحین کے غور و خوض سے پر ہوسکتی ہے جن کا قول خود انہیں کے عمل سے ٹکراتا ہے، اور نہ طاقت کے ذریعہ سے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے خیالات کو شبیری کردار کی کسوٹی پر پرکھے۔ اس میں حسینی اسپرٹ پیدا ہوجائے، اور اس کے ذہن کی رگوں میں کربلا کے شہیدوں کا خون دوڑنے لگے۔

واقعۂ کربلا کو عالم وجود میں آئے تیرہ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں مگر آج بھی انسان اپنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کا حل ذات حسینی میں ڈھونڈ سکتا ہے۔ آج بھی انسانی مشام کا رنامۂ حسینی سے معطر ہوکر اس جہان کثیف کو کثافتوں اور غلاظتوں سے پاک کرسکتے ہیں اور ایک ایسا لطیف ماحول بنا سکتے ہیں جس کی طرف عالم بالا کے رہنے والے بھی نگاہ رشک سے دیکھنے پر مجبور ہوجائیں۔